مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی
مدرس جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک

قیامت خیز آفات ونوازل کے وقت ہمارا کردار وعمل

الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ ومانزل من الحق (الایۃ)

کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو گڑگڑائیں ان کے دل اللہ کے یاد سے اور جو اترا ہے سچا دین یعنی وقت آ گیا ہے کہ مومنین کے دل قرآن کریم اور اللہ کی یاد اور اسکے سچے دین کے سامنے جھک جائیں اور نرم ہو کر گڑگڑانے لگیں۔

وطن عزیز اور مملکت خداداد پاکستان آج کل ایک اور بہت بڑی آفت اور سیلاب بلاخیز سے دوچار ہے' ابھی ہم ہزارہ' آزاد کشمیر اور اس کے قرب وجوار میں ہولناک زلزلہ کی تباہ کاریوں پر ماتم کناں تھے کہ اچانک ملک پر ہر طرف سے سیلابوں اور دریاؤں میں طغیانیوں کا دہشت انگیز اور مہیب سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجہ میں شہر اجڑ گئے۔ بستیاں ویران ہوئیں' اور سینکڑوں کی تعداد میں دیہات صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ اور ایسے نیست ونابود ہو گئے۔ **کان لم تغن بالامس** گویا یہاں پر سرے سے کوئی آبادی ہی نہ تھی۔

یہ دنیا تغیر پذیر ہے اس میں انقلابات آتے رہتے ہیں' کبھی آسمانی بلائیں آتی ہیں' کبھی زمینی آفتیں دفعتاً نازل ہو جاتی ہیں' کبھی زلزلے آتے ہیں' کبھی بجلیاں گرتی ہیں' کبھی وحشت ناک تاریکیاں پھیل جاتی اس کی وجہ سے تباہیاں مچیں۔ اور نہ صرف انسانی حیات بلکہ حیوانی زندگی شدید مشکلات اور مصائب وآلام سے دوچار ہوئی۔ حالیہ ملک گیر سیلاب اور قیامت خیز طوفاں بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ جس میں ہم جیسے غافلوں کے لئے تنبیہ اور الارم کا سامان موجود ہے۔

قرآن کریم میں طوفان نوحؑ کا ذکر آیا ہے کہ کس طرح جب قوم نوح نے سرکشی اختیار کی اور بغاوت و طغیان اور نافرمانی پر اتر آئی تو وہ قوم سیلاب بلا کی نذر ہو گئی اور ان معدودے چند مومنین کے سوا باقی پوری قوم غرق آب ہو گئی۔ اسی طرح دوسری قومیں جب وہ بغاوت پر اتر آئیں۔ خدا اور رسول کی نافرمانی کی تو وہ قومیں مختلف النوع آفات سے صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ ارشاد ربانی ہے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر' پھر تھا کوئی کہ بھیجا ہم نے اس پر پتھراؤ ہوا سے اور کوئی تھا کہ اس کو پکڑے چنگھاڑ نے اور کوئی تھا کہ اس کو ہم نے دھنسا دیا زمین میں۔ اور کوئی تھا کہ اس کو ڈبا دیا ہم نے۔ اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے' پر تھے وہ اپنا ہی برا کرتے۔

یعنی ان میں سے ہر ایک کو اپنے جرم کے موافق سزا دی گئی' اس آیت کریمہ میں قوم لوط قوم عاد وثمود' قارون' فرعون و ہامان اور قوم نوحؑ کی ہلاکتوں کی طرف اشارہ ہے جن کی تفصیل قرآن کریم کی مختلف سورتوں اور آیتوں میں موجود ہے۔ یہ تو وہ قومیں ہیں جنہوں نے کفر اور شرک کا ارتکاب کیا اور علی الاعلان خدا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی پر اتر آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا عبرت ناک انجام ہمیں بتادیا۔ مسلمانوں اور مؤمنوں پر بھی گاہے بگاہے ہلاکت خیز آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں' تاکہ ہم اللہ کی یاد سے غافل نہ رہیں اور ایسی سرکشیاں اور نافرمانیاں اختیار نہ کریں۔ جس سے سابقہ قومیں صفحۂ ہستی سے نابود ہوگئیں۔

خود حضرت رسالتمآب ﷺ کے زمانہ میں بھی جب اسی قسم کے مہیب احوال رونما ہوجاتے تو آپ بے قرار اور بے چین ہوجاتے۔ اور خوف وخشیت کی کیفیت آپ کے چہرہ انور سے عیاں ہوجاتی۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب سورج گہن یا چاند گہن لگتا تو آپ کا رنگ مبارک متغیر ہوجاتا اور مسجد اور صلوٰۃ ونماز کی طرف متوجہ ہوجاتے۔ فرماتے ہیں: **اذا رایتم شیا من هذه الاهول فافزعوا الی الصلوة** جب تم ان خوف کی باتوں میں سے کوئی چیز دیکھو تو گھبرا کر نماز کی طرف جاؤ۔ امام مسلم نے اس حدیث کو یوں ذکر فرمایا ہے۔ **عن ابی موسیٰ قال خسفت الشمس فی زمن النبی ﷺ قال ان هذه الایات التی یرسل الله لاتکون لموت احد ولا لحیاته ولکن الله یرسلها یخوف به عباده فاذا رایتم منها شیأ فافزعوا الی ذکره ودعائة واستغفار.**

اس حدیث میں ہے کہ اس قسم کے خوف کی چیز ہو تو دعا اور استغفار میں مشغول ہونا چاہیے اسی طرح حضرت ابوالدرداسے روایت ہے کہ اگر کسی شب تیز ہوا چلتی تو آپ بے قرار ہوکر مسجد تشریف لے جاتے اور جب تک ہوا تھم نہ جاتی خدا کے حضور سجدہ ریز رہتے۔ سورج گہن یا چاند گہن لگتا تو جب تک گہن ختم نہ ہوجائے' نماز میں مشغول رہتے۔ حضرت انسؓ کے زمانہ میں ایک دفعہ سخت تاریکی چھا گئی' ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کبھی حضور ﷺ کے زمانے میں بھی ایسی باتیں پیش آتی تھیں۔ حضرت انسؓ نے فرمایا۔ معاذ اللہ اس وقت اگر ہوا بھی تیز چلتی تو ہم لوگ قیامت کے خوف سے مسجد کی طرف دوڑ پڑتے' سورج گرہن کے وقت تو نماز باجماعت حضور ﷺ سے ثابت ہے۔ البتہ چاند گرہن کے وقت یا دیگر خوفناک چیزوں اور دہشت انگیز آفتوں کے وقت تنہا تنہا نماز پڑھی جائے۔ چنانچہ مشہور فقیہہ علامہ شرنبلالی فرماتے ہیں: گھبراہٹ اور خوف کے موقعہ پر تنہا تنہا نماز پڑھی جائے' گھبرا دینے والی چیزوں سے مراد زلزلے' بجلیوں کی کئی مسلسل کڑک' تاروں کا ٹوٹنا' رات میں تیز روشنی کا نمودار ہونا' ژالہ باری' مسلسل

بارشیں امراض کا پھیلنا اور دشمن کا سخت خوف وغیرہ ہیں۔ بندوں کو ڈرانے کے لئے ہیں تاکہ وہ گناہ چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کا راستہ اختیار کریں' جس میں ان کی کامیابی اور صلاح ہے اور بندہ کے لئے اپنے رب سے رجوع کرنے کی سب سے قریبی حالت نماز ہے۔

مگر مقام صد افسوس وحسرت ہے کہ ایسی آفات اور ایسے دہشت ناک مناظر کے موقع پر ہمارے دل نرم اور پسیج نہیں ہوتے بلکہ یہ دردانگیز اور محشر بداماں گھڑیاں بھی ہم اپنے لئے باعث تسکین دل سمجھتے ہیں۔ اور مصیبت زدوں' خانماں بربادوں اور بے یارومددگار بیکسوں کی لاچاری وبے بسی کا تماشہ دیکھنے کے لئے جاتے ہیں' ان کی تصویر کشی کرتے ہیں ان کی فلمیں اور وڈیوز بناتے ہیں۔ فیا للاسف

ایسے دلدوز مناظر کے دیکھنے پر تو زمین کا سینہ بھی شق ہوجاتا ہے' آسماں بھی خون کے آنسو روتا ہے۔ پوری کائنات پر ایک خوف طاری ہوجاتا ہے۔ افسوس اس سے زیادہ اور ہماری بے حسی' اخلاقی پستی اور دین بیزاری کیا ہوگی اور اب تو یہ وبا اتنی عام ہوچکی ہے کہ اخلاقیات کے بڑے مدعی اس میں مبتلا ہیں۔

بربادی گلشن کی خاطر بس ایک ہی الو کافی تھا
ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

ہماری حالت تو ان لوگوں سے بھی بدتر ہے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے:

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔

''اور جب پہنچے انسان کو تکلیف' پکارا ہم کو پڑا ہوا یا بیٹھا ہوا یا کھڑا ہو جب کھول دیں اس سے وہ تکلیف چلی جائے' گویا کبھی نہ پکارا تھا ہم کو کسی تکلیف پہنچنے پر۔ اسی طرح پسند آیا ہے بیباک لوگوں کو جو کچھ کررہے ہیں' یعنی انسان اول بیباکی سے عذاب طلب کرتا ہے اور برائی اپنی زبان سے مانگتا ہے مگر کمزور اور بودا اتنا ہے کہ جہاں ذرا تکلیف پہنچی' گھبرا کر ہمیں پکارنا شروع کردیا۔ جب تک مصیبت رہی' کھڑے بیٹھے' لیٹے ہر حالت میں خدا کو پکارتا رہا' پھر جہاں تکلیف ہٹائی گئی' سب کہا سنا بھول گیا۔ گویا خدا سے کبھی واسطہ نہ تھا وہ ہی غرور وغفلت کا نشہ۔ وہی اکڑفوں رہ گئی۔ جس میں پہلے مبتلا تھا۔ حدیث میں ہے کہ تو خدا کو اپنے عیش وآرام میں یاد رکھ خدا تجھ کو تیری سختی اور مصیبت میں یاد رکھے گا۔ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ کسی وقت خدا کو نہ بھولے سختی پر صبر اور فراخی پر خدا کا شکر ادا کرتا رہے۔ یہ ہی وہ چیز ہے جس کی توفیق مومن کے سوا کسی کو نہیں ملتی۔'' (تفسیر عثمانی)

ڈاکٹر احسان اللہ فہد فلاحی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ عدل

(یونانی فکر، عیسائیت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ)

متکلمِ اسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۳ء) کا تصورِ عدل ان کے تصورِ ارتفاقات سے پوری طرح مربوط ہے۔ عدل پر کوئی گفتگو کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نظریۂ 'ارتفاقات' کی تشریح سامنے رہے، کیوں کہ عدل وانصاف کا یہ نظام 'ارتفاق سوم' ہی کے ذریعہ وجود میں آتا ہے۔ قانونی اور سیاسی پہلوؤں کے علاوہ ولی اللّٰہی نظریۂ عدل کا اہم تر پہلو اس کا سماجی وروحانی تصور ہے۔ شاہ صاحب کا نظریۂ عدل ان کے ذہن کی اپج نہیں ہے۔ عدل وانصاف کا تصور کم وبیش انسانی معاشرے میں ہمیشہ رہا ہے۔ عظیم یونانی مفکرین افلاطون اور ارسطو نے اس کی خشتِ اول رکھی، جس سے عیسائیت متاثر تو ہوئی، مگر اس نے سماجی عدل کا کوئی نظام قائم نہیں کیا۔ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں سماجی عدل کا بھرپور تصور، جس میں قرآن وسنت کو بنیاد بنایا گیا تھا، اپنے وسیع ترین اطراف وجہات کے ساتھ پوری طرح نافذ ہوا۔ تاریخ اسلام میں شاہ ولی اللہؒ غالباً پہلے مفکر ہیں جنھوں نے اسلام کے اس سماجی انصاف کی عمرانیاتی توجیہ بڑے مدلل انداز میں اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں کی۔ بعد میں دورِ جدید کے احیائے اسلام کے علم بردار دانش وروں اور مصلحین مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور سید قطب شہیدؒ نے شاہ ولی اللہؒ سے بھرپور اکتساب کیا اور اسلامی نظریۂ عدل کی ترجمانی وتشریح میں بعض پہلوؤں سے اہم اضافے کیے۔

فکرِ یونانی میں عدل کا مفہوم

مغربی مصنفین نے عام طور پر عدل کے تصور کا بانی یونانی مفکر اور فلسفی افلاطون کو قرار دیا ہے۔ اس نے اپنی مثالی مملکت کی بنیاد محض انصاف پر رکھی ہے۔ اس کے خیال میں انسان کے افکار ونظریات کو اس وقت تک درست نہیں قرار دیا جاسکتا، جب تک کہ اس میں صداقت اور انصاف کے عناصر موجود نہ ہوں۔ کسی بھی معاشرہ کے لیے صحت مندی، خوش حالی اور باہمی امداد کی بنیاد پر استوار زندگی گزارنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے سب ہی افراد کو انصاف کا حق حاصل ہو، کیوں کہ انصاف حقائق کو پانے اور افراد کے حقوق کو مہیا کرنے کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے۔[۱]

تصورِ عدل کی وضاحت کرتے ہوئے افلاطون نے ریاست کو ایک جسم سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جس طرح انسان کے جسمانی اعضاء ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ پورے جسم کے کسی ایک عضو کے کسی حصے میں ذرا سی تکلیف ہو جائے تو پورے جسم کو اس کا درد محسوس ہوتا ہے، اسی طرح ریاست ایک جسم اور افراد اس کے اعضاء ہیں۔ اگر معاشرہ میں کسی ایک فرد کو کوئی تکلیف ہو تو لازماً پورے معاشرے کو اس کا احساس ہونا چاہیے اور اس تکلیف کو دور کرنے کے لیے وسائل بروئے کار لانے چاہئیں۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جسم کو آرام پہنچانے کے لیے اس کے تمام اعضاء کی نگہ داشت کی جائے اور ان کو صحت مند رکھا جائے۔[۲]

افلاطون نے سوسائٹی کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اولیت فلاسفہ کو حاصل ہے۔ دوسرے درجے میں فوجی صلاحیت کے حامل افراد ہیں اور تیسرے درجے کے افراد وہ ہیں جو پیشہ ور یا مزدور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تینوں میں اگرچہ بعض طبقے کچھ مراعات سے محروم کر دیے گئے ہیں، مثلاً مزدور کو کوئی حق نہیں کہ وہ فوجی امور میں دخل دے اور کسی فوجی کو بادشاہ بننے کی تمنا بھی نہ کرنی چاہیے، لیکن جہاں تک انصاف کا تعلق ہے اس کا حصول ان سب کے لیے اسی طرح یکساں طور پر ضروری ہے جس طرح زندگی گزارنے کے لیے خوراک۔

اس نظریۂ انصاف کے مطابق معاشرہ کے ہر طبقہ کو حصولِ انصاف کے لیے خود کوشش کرنی چاہیے اور یہ کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ ہر طبقہ کے افراد کو اپنے اپنے فن میں مکمل مہارت حاصل ہو۔ بہ صورت دیگر ان کو کسی دوسرے سلوک کا حق دار گردانا جائے گا۔ کیوں کہ جرمِ ضعیفی کی سزا دینا بھی انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس لیے زندگی کو بہتر سے بہتر انداز میں گزارنے کے لیے اور اپنے حقوق کو مناسب ترین انداز سے حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض منصبی کو پوری استعداد اور کاملیت سے سرانجام دے۔ ان فرائض کی تکمیل نہ کرنے سے اگر کسی شخص کو کوئی نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو یہ انصاف کے عین مطابق ہے۔[۳]

ارسطو کا نظریۂ انصاف کسی حد تک اپنے استاد افلاطون کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انصاف کی بنیاد اخلاق ہے۔ قانون بنیادی، قدرتی اور اخلاقی ہوتے ہیں اور انصاف یہی ہے کہ ریاست کا ہر فرد اپنے فرائض منصبی کو بہ اندازِ احسن ادا کرتا رہے اور قانون یا انصاف کے توڑے جانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس نے افلاطون کے نظریات پر کچھ اضافہ کیا ہے۔ وہ انصاف کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ (۱) قابلِ تقسیم (۲) اصلاح کن۔ قابلِ تقسیم انصاف کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ یہ انصاف ہر ایک فرد، سیاسی جماعت اور حکومت کے ساتھ اس کی قدر، قیمت اور مقام کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مثلاً جمہوریت میں اس کی بنیاد شرح پیدائش پر، چند سری حکومتوں میں امارت پر اور اشرافیہ میں نیکی کی کثرت پر ہوگی۔ اس قابلِ تقسیم انصاف کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص حکومت کے لیے اپنے فرائض خلوصِ نیت سے ادا کرتا رہے اور افراد کے حقوق و فرائض کو اگر ترازو سے تولا جائے تو کوئی پلڑا بھاری یا ہلکا نہ رہے۔